© rasailojaraid.com

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

سرسید کی زندگی کا سب سے بڑا کرائسس

مولوی سمیع اللہ خاں جو ایک با اقتدار اور با اثر بزرگ ہونے کے علاوہ کالج وغیرہ کے معاملات میں اب تک سرسید کے مددگار اور ان کے دست راست رہے تھے اب ان کا اس درجہ مخالف ہو جانا سرسید کے لیے ایک شدید حادثہ سے کم نہیں تھا کہ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل کا واقعہ پیش آیا اور اس نے سرسید کے لیے مصائب کی تکمیل کردی۔ ہوا یہ کہ سرسید کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور یوں بھی مخالفتیں بڑھ رہی تھیں۔ سرسید نے خیال کیا کہ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کالج کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اس بنا پر بہتر ہے کہ ایک بل کے ذریعہ کالج کا مستقبل محفوظ کر دیا جائے، تاکہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل علیٰ حالہ کرتا رہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس بھیج دیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر اور ان کے ساتھیوں نے اس بل کی بعض دفعات سے اور علی الخصوص اس دفعہ سے سخت اختلاف کیا جس کی رو سے سرسید نے اپنے فرزند ارجمند جسٹس سید محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنانے کی تجویز کی تھی۔ بہرحال بل جوں کا توں ٹرسٹی بل کے نام سے سرسید کے حامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممبروں کی کثرت سے پاس تو ہو گیا۔ لیکن سرسید کے لیے ایک مستقل عذاب و بلائے جان بن گیا، مخالفت کی اصل وجہ وہی یورپین اسٹاف کا معاملہ تھا۔ سرسید کو اس کا یقین تھا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم و نسق کا جو معیار قائم ہو گیا ہے وہ یورپین اسٹاف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور پھر ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں حکومت سے جو توقعات ہیں اس اسٹاف کے بغیر ان کا پورا ہونا بھی مشکل ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کا گروپ ان اساتذہ کا مخالف تھا۔ اور ان کے وجود کو اپنی تہذیب، معاشرت اور آزادی کے لیے خطرناک سمجھتا تھا عام طور پر خیال تھا کہ سرسید کے بعد کالج کے سکریٹری مولوی صاحب موصوف ہوں گے۔ سرسید نے خیال کیا کہ اگر واقعی ایسا ہوا تو کالج سے یورپین اساتذہ کا پتہ کٹ جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کالج اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے بدظن نہیں تو مشتبہ ضرور ہو جائے گی اور ان دونوں چیزوں کا انجام یہ ہوگا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم و نسق کا معیار ہی پست نہ ہوگا بلکہ علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلبہ کے لیے سرکاری ملازمت کے حصول میں چند در چند دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ آئندہ کے لیے اس خطرہ کے سدِ باب کا طریقہ اس وقت یہی ہو سکتا تھا کہ جسٹس محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنایا جائے۔ خود محمود اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس بارِ گراں کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ تھے۔ لیکن ان کو کسی نہ کسی طرح رضامند کر لیا گیا اور ٹرسٹی بل کی ایک دفعہ کی رو سے جسٹس محمود جوائنٹ سکریٹری ہو گئے۔

ٹرسٹی بل کی مخالفت کی بڑی وجہ یورپین اساتذہ اور تعلیم کی گرانی وغیرہ تو سرسید کی مخالفت کے وجوہ تھے ہی، لیکن ٹرسٹی بل کی مخالفت کی بڑی وجہ جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ کے لیے اپنے ہی فرزند کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نامردگی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ قطعی طور پر دیکھیے تو سرسید کے لیے یہ بات سخت قابلِ اعتراض اور ان کے مرتبہ اور مقام سے حد درجہ فروتر تھی بھی! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اتقوا موا ضع التُّھَمُ یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو۔ یوں تو یہ ارشاد ہر انسان کے لیے واجب العمل ہے لیکن علی الخصوص وہ لوگ جو کسی تحریک کے بانی ہوں اور اس حیثیت سے ہزاروں انسانوں کو ان پر اعتماد ہو ان کے لیے تو اس پر عمل کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا۔ اگر میری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں حطیم کو گرا دیتا۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا کہ منافقین جو اسلام کے لیے مار آستین ہیں آپ ان کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے تو آپ نے فرمایا "میں تو ان کو جانتا ہوں مگر مسلمان تو انھیں نہیں پہچانتے۔ اس حالت میں میں نے ان کو قتل کیا تو لوگ کہیں گے لو دیکھو! محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشاد نبوی قوم کے ہر قائد اور تحریک کے ہر بانی اور اسی طرح حکومت کے ہر سربراہ کے پیشِ نظر رہنا چاہیے ورنہ کتنی بڑی بڑی تحریکیں ہیں جو بانی تحریک کی طرف سے کسی معاملہ میں ذرا بے اعتمادی پیدا ہوئی نہیں کہ وہ ختم ہو گئیں۔

سرسید کے موقف کا نفسیاتی تجزیہ

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اس ارشاد نبوی کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کی اور اس کی پاداش بھی اس قدر سخت بھگتنی پڑی کہ ان کا کام ہی تمام ہو گیا ان کی مخالفت کی جو چنگاریاں اب تک مروّت اور لحاظ کے خاکستر میں دبی دبی سی تھیں اب وہ بھڑک کر شعلہ فشانِ آتش تھیں۔ نواب وقار الملک مولانا حالی اور دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معزز حضرات نے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک بیان تیار کیا تھا جس میں سرسید کی پالیسی کی مذمت کالج اور قوم کے حق میں اس کے نقصانات اور اپنی اس سے برأت کا اعلان کیا گیا تھا لیکن ابھی یہ بیان اخبارات میں بھیجا نہ گیا تھا کہ اچانک سرسید کے انتقال کی خبر ملی اور وہ بیان روک لیا گیا۔ لیکن بات حقیقی ہو ہمیشہ اتنی کہنی چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سرسید کی نسبت وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ہرگز نہ کہنا چاہیے تھا۔[۵] حقیقت

[۵] ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ میں ایم۔ اے میں داخلہ کی غرض سے میں پہلی مرتبہ علی گڑھ آیا تو ولایت منزل میں جہاں اب فیکلٹی آف تھیالوجی ہے۔ قیام کیا تھا۔ یہاں ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کے ساتھ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رہتے تھے۔ مولوی صاحب میرے والد صاحب قبلہ کے بہت گہرے دوست تھے اور اس تعلق سے مجھ سے بھی بہت زیادہ محبت اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ اسی تقریب سے میں نے یہاں قیام کیا تھا۔ مجھے یاد ہے تین چار دن جب تک میں یہاں رہا۔ روزانہ رات کو سوتے وقت ڈپٹی حبیب اللہ خاں اور مولوی طفیل احمد صاحب دونوں بزرگ جو سرسید کے صحبت یافتہ اور علی گڑھ کے نام پر فدا تھے۔ سرسید کے حالات مزہ لے لے کر بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سرسید کی نجی اور خانگی زندگی کے چند ایسے نہایت دردانگیز اور سبق آموز واقعات بھی سنائے جو آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملیں گی اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید درحقیقت کردار اور اخلاق کے اعتبار سے کتنے بلند انسان تھے اور یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ سرسید کا انتقال کس بے کسی کے عالم میں ہوا اور انتقال کے بعد جب سرسید کے اثاثہ کا جائزہ لیا گیا تو اس میں کفن اور دفن کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ٹرسٹی بل پر جب ان کی مخالفت بڑھی تو لوگوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ سرسید کو کون مخلص خادم قوم و ملت کہتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ سرسید کے لیے صرف دو صورتیں تھیں۔
(۱) ایک یہ کہ ان کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سکریٹری ہوں اور کالج سے یورپین اساتذہ کا خاتمہ ہوجائے۔ اس صورت میں سرسید بدنام نہ ہوتے لیکن ان کے ذہن میں کالج میں اعلیٰ تعلیم، ڈسپلن اور حکومت سے قرب کے جو فوائد تھے وہ سب ختم ہوجاتے اور کالج اس معیار پر قائم نہیں رہتا۔
(۲) اس کی متبادل صورت یہ تھی کہ سرسید جسٹس محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنولتے اس صورت میں سرسید کی بدنامی اور رسوائی یقینی تھی۔ لیکن کالج سرسید کے مقاصد کے مطابق کام کرتا رہتا۔ گویا کالج یا اپنی نیک نامی اور مقبولیت

بقیہ صفحہ ۱۵۲:- انہوں نے یہ سارا ڈھونگ سید محمود کو انگلینڈ میں تعلیم دلانے اور پھر انہیں چیف جسٹس بنانے کی غرض سے رچایا تھا۔ " تفو بر تو اے چرخ گردان تفو "
اس حاشیہ کی پہلی سطر سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ میں نے ایم۔اے۔ علیگڈھ سے کیا ہے یہاں اس وقت مولانا عبدالعزیز میمن کے ساتھ علمی وادبی عقیدت وارادت کے باعث ان سے استفادہ کی غرض سے میں آیا تو اسی غرض سے تھا اور وہاں میرا داخلہ منظور بھی ہوگیا تھا لیکن جب میں نے وہاں بکثرت لوگوں سے یہ سنا کہ میمن صاحب روپیہ پیسہ کے ساتھ علم کے معاملہ میں بھی بخیل ہیں تو میں بددل ہوگیا اور ادھر دہلی آیا تو شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے جو مجھ پر بے حد شفیق تھے فرمایا: "میں دو برس کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہورہا ہوں۔ اگر تم دہلی سے ایم۔اے کرلو تو میں تم کو اپنی جگہ بٹھا کر جاؤں گا۔ یہ بات میرے لیے بڑی خوش کن تھی۔ میں نے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مولانا نے جو فرمایا تھا وہی ہوا۔ میرا ایم۔اے کا نتیجہ آیا ہی تھا کہ مولانا ریٹائرڈ ہوگئے اور میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں لکچرر مقرر ہوگیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہرِ دلعزیزی، ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا! سرسید نے دوسری راہ کو اختیار کیا! یہ درحقیقت ان کی غیر معمولی اخلاقی جرأت اور عزم و ہمت کی دلیل ہے اور اس لیے لائقِ ستائش!

سرسید کی وفات لیکن یہ جرأتمندانہ اقدام کرتے وقت سرسید اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ اسلام عقلِ سلیم اور قانونِ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی کام خواہ کتنے ہی اچھے جذبہ سے کیا جائے بہر حال اس کا طریقِ کار بھی اچھا ہونا چاہیے، ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشادِ گرامی گزرا ہے اس کا منشا بھی یہی ہے۔ چنانچہ سرسید یہ کرنے کو تو کر گئے۔ ٹرسٹی بل اکثریت سے منظور ہوگیا۔ لیکن سرسید کے اس طریقِ کار کا جو طبعی ردِعمل ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا۔ سرسید کا سفینۂ حیات مخالفتوں کے طوفان میں گھر گیا۔ یہ ساری عمر ہر قسم کے طوفانوں کا بڑی جرأت و ہمت سے مقابلہ کرتے رہے تھے۔ لیکن پیہم حوادثِ روزگار نے دل شکستگی اور آزردگی خاطر کی اس منزل میں لا کھڑا کر دیا تھا جہاں ایک رستمِ دوراں کو بھی کہنا پڑتا ہے۔

بہت روز طوفاں کی موجوں سے کھیلے
بس اب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

اور غالباً اسی قسم کا کوئی عالم تھا جس میں مرزا غالب ایسے کھلنڈرے ہنوڑ اور خوش باش شخص نے کہا ہے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

تھوڑی بہت جو کسر باقی تھی وہ غبن کے مذکورہ بالا واقعہ نے پوری کر دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ ازیں خانگی زندگی میں بھی بیٹے کی سخت علالت، سوء مزاج اور کجو کی حد درجہ بد دماغی کے باعث سرسید کو جو صدمات پہنچے انھوں نے سمندِ ناز پہ تازیانہ کا کام کیا باایں ہمہ صبر و ضبط کا یہ عالم کہ بقول مولانا حالی کے "کبھی کسی نے اس کوہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہوگا" اس قسم کے غیر معمولی صبر و ضبط کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان پر حیرت و گمشدگی کی کیفیت کا غلبہ ہو جاتا اور اس کی قوتِ گفتار سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سرسید کو بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں :-

"مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے ان کو چپ لگ گئی تھی۔ بولتے بہت کم تھے اور ہاں اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا "آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟" سرسید نے کہا: "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں"

آخر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو شب میں دس بجے کے قریب ایک مختصر مگر سخت علالت کے بعد ملتِ اسلامیہ ہند کا یہ عظیم مجاہد اور قائد اپنے رب سے جا ملا اور اس نے جس ہمیشہ کے لیے چپ رہنے کی عادت ڈالنی شروع کر دی تھی آخر اس کا وقتِ موعود بھی آ گیا۔

کفن سرکاؤ سرسے بے زبانی دیکھتے جاؤ

اللھم اغفر لہ وارحمہ

سرسید کی سیاسی پالیسی چونکہ سرسید کی سیاسی پالیسی کا بہت گہرا تعلق ان کی تعلیمی پالیسی کے ساتھ ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اس پر بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گفتگو کی جائے۔

آج کل کے مدعیان قوم پرستی و وطن دوستی نے سرسید کی سیاسی پالیسی پر بڑی نکتہ چینی کی اور بہت لحاظ کیا تو بجائے لبرل کہنے کے ان کو قدامت پرست (CONSERVATIVE) کہا ہے۔ سرسید پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکتے تھے۔ اسی سلسلہ میں چند اور باتیں کہی جاتی ہیں مثلاً

(۱) جب وہ ۱۸۸۷ء میں سول سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے تو انھوں نے انگلینڈ کے سول سروس کمیشن کے بغیر اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کی مخالفت کی۔

(۲) انھوں نے جمال الدین افغانی کی اس تحریک کی مخالفت کی جس کے ذریعہ وہ عالم اسلام کے جسد مردہ میں حریت واستقلال کی روح پھونک رہے تھے اور جس کو عام طور پر پان اسلامزم تحریک کہتے ہیں۔

(۳) انھوں نے وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کی مخالفت کی حالانکہ سب سے پہلے اس کا مطالبہ انھوں نے ہی کیا تھا۔

(۴) سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے بالمقابل دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا مقصد انگریزی میں رسالے اور پمفلٹ شائع کرنا اور برطانوی پارلیمنٹ کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار و نظریات سے باخبر رکھنا تھا جو کانگریس کے مخالف تھے۔

(۵) انھوں نے ہندوستان کے وفادار مسلمان کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن یہ اعتراضات ضمنی ہیں سب سے بڑا اور اصل اعتراض یہی ہے کہ سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کی اس میں شرکت گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے اب ہم اس پر کلام کریں گے۔

سرسید کا نظریۂ قومیت اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ سرسید کے نزدیک قومیت کا کیا تصور تھا؟ جس شخص نے سرسید کے لکچروں، تقریروں اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید جب کبھی لفظ قوم بولتے تھے تو اس سے مراد بلا اختلاف مذہب وملت ہندوستان کے سب باشندے ہوتے تھے۔ ایک تقریر میں جو انھوں نے ایک سپاسنامہ کے جواب میں ۱۸۸۴ء میں کی تھی۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا:۔

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جن میں میں لفظ نیشن (NATION) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیونکہ جو بات ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو کہ ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا مجھ کو اسی قوم کی بہبودی کا دل سے خیال تھا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں ایک لکچر میں فرمایا۔

"درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں (ہندو اور مسلمان) باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے باہمی اتفاق اور ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی وبہبود ممکن ہے۔ میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن ہے اور اس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر یہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔"

اسی بات کو اس سے زیادہ واضح اور مدلل طریقہ پر انھوں نے ۱۸۸۴ء میں گورداسپور میں ایک تقریر کرتے ہوئے پھر دہرایا اور کہا۔

"پرانی تاریخوں اور پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور مختلف مذاہب کے لوگ ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندے پر بولا جاتا ہے تو پھر اے ہندو اور مسلمانوں، کیا تم ہندوستان کے سوا کسی اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک ہے ایک ہونا چاہیے۔"

آزادیٔ وطن کا جذبہ آپ نے دیکھا! قومیت سے متعلق سرسید کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو ایک بڑے سے بڑے قوم پرور (نیشنلسٹ) کا ہو سکتا ہے اور جو ہونا چاہیے۔ یعنی ملکی اور وطنی معاملات و مسائل میں وہ مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کے فرق اور امتیاز کے قائل نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اپنے وطن کے لیے آزادی کا جذبہ بھی ان میں کسی سے کم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ وائسرائے کی لیجس لیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے جبری قانون ٹیکۂ چیچک جس کا مسودہ خود انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کو پیش کرتے ہوئے سرسید نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا۔

"میں منجملہ ان لوگوں کے ہوں جو کسی جبری قانون کو اشد ضروری حالت میں ہی قابلِ جواز خیال کرتے ہیں۔ ورنہ رعایا کی آزادی ایک حق منجملہ ان عزیز ترین حقوق کے ہے جو اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرح میں بھی جن کی خواہش کرتا ہوں۔"

ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے زور سے کہا:۔

"اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں، بہت بڑا لبرل ہوں، لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے جو شخص اس طرح کے الیکشن کے برخلاف تھا وہ میں تھا اگر میں تیجنے

لہ یہ سب اقتباسات پروفیسر خلیق احمد نظامی کی فاضلانہ کتاب سید احمد خاں سے ماخوذ ہیں۔ آئندہ بھی سرسید کی سیاسی پالیسی کے عنوان کے تحت جو اقتباسات بغیر حوالہ کے آئیں وہ سب اسی کتاب سے ماخوذ سمجھنا چاہئیں۔ موصوف نے خود کوئی بات بغیر حوالہ کے نقل نہیں کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ رپن کی رائے میری ہی اسپیچ کے زور سے بدلی کہ (لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ میں) ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث انتخاب الیکشن سے"۔

۱۸۶۹ء میں جب گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے لیے برطانوی پارلیمنٹ میں بل پیش کیا گیا تو سرسید اس زمانہ میں انگلستان میں مقیم تھے۔ وہاں سے انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا "حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے لیے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا تو کل رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی"۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اس زمانہ کے حالات کو مدِنظر رکھا جائے تو سرسید کے یہ خیالات ترقی پسندانہ ہی نہیں۔ بلکہ انقلابی ہیں۔

کانگریس کی مخالفت کے اسباب و وجوہ

اب آئیے اس پر غور کریں کہ اس درجہ ترقی پسند اور انقلابی ہونے کے باوصف وہ کانگریس کے اتنے مخالف کیوں تھے؟ اس سلسلہ میں مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری نے "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں مفصل بحث کی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ کالج کے قائم ہونے کے دس برس بعد تک تو سرسید کے خیالات وافکار بہت اعلیٰ اور حریت پسندانہ رہے لیکن اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ مسٹر بیک پرنسپل کے زیرِ اثر آتے رہے یہاں تک کہ وہ سرسید کے سیاسی فکر و ذہن پر ایسا چھا گئے کہ سرسید کا قلب ماہیت ہو گیا۔ موصوف کے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفروضہ کے جواب میں تو ہم صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی بڑے کانگریسی، حریت پرست اور محب وطن ہوں، بہرحال اس وصفِ خاص میں وہ پنڈت جواہر لال پر سبقت نہیں لے جا سکے۔ پنڈت جی سرسید کی سیاسی پالیسی کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان | بورژوا ہندوؤں کی کوشش سے وطن پرستی کی ایک نئی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ سرسید کے نزدیک اس تحریک میں شرکت سے مسلمانوں کی توجہ اور دھیان اصل تعلیم سے ہٹ جاتے اس لیے انھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی ہندو جو مغربی تعلیم میں مسلمانوں سے نصف صدی آگے تھے، حکومتِ وقت پر نکتہ چینی کرنے کا مشغلہ اختیار کر سکتے ہیں، لیکن سرسید اپنے تعلیمی کاموں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون چاہتے تھے اور اسی لیے جلد بازی میں وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کاموں کو نقصان پہنچے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو تمام کوششیں جدید تعلیم سے آراستہ ہونے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، اس تعلیم کے بغیر میرا خیال ہے۔ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں کم حیثیت ہو جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے تعلیم میں بھی آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ مسلمانوں کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ وہ بورژوا تحریک وطنیت میں شریک ہو جاتے۔ سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو ہمیں واضح طور پر معتدل نظر آتی ہیں، درحقیقت ایک قسم کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں (سید احمد خاں از پروفیسر نظامی ص ۱۵۶)

سچ یہ ہے کہ سرسید کے سیاسی فکر اور کانگرس سے ان کی علیحدگی کے اصل سبب کا تجزیہ پنڈت جی نے مندرجۂ بالا بیان میں جس بالغ نظری، روشن دماغی اور حقیقت پسندی سے کیا ہے وہ اس بحث میں حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔

مولانا حالی کا بیان | اس سلسلہ میں مولانا حالی نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بھی پنڈت جی کے بیان سے ملتا جلتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے۔ لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے وہ ان کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے۔ اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایجی ٹیشن میں شریک ہونے سے باز رہے جو دیوانوں کے لیے ہو کی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ 'حلوہ خوردن را روئے باید'۔"

اس کے بعد مولانا نے وہ تمام ذہنی تعلیمی، اخلاقی، معاشی، اور سماجی عیوب اور نقائص گنائے ہیں جن میں اس وقت مسلمان مبتلا تھے اور اسی اعتبار سے ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :-

"ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی، جب ہماری قوم (مسلمانوں) کا یہ حال ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا منہ لیکر ہم گورنمنٹ سے ان حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں۔ مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے ان اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ اسی لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ۔

(حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۱۱۵ - ۱۱۶)

محمڈن نیشنل کانفرنس میں شرکت سے انکار

کانگریس تو کانگریس، محمڈن نیشنل کانفرنس جس کو ۱۸۸۰ء میں سید امیر علی نے قائم کیا ــــ تھا اور جس کی اس وقت وہی حیثیت تھی جو بعد میں مسلم لیگ کی ہوئی۔ جب سید امیر علی نے سرسید سے اس میں شرکت کی درخواست کی تو سرسید نے انکار کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کا مشترک پلیٹ فارم ہو یا کوئی انجمن صرف مسلمانوں کی ہو، بہر حال سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونا مضر ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی مثال

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے زیر فیض و تربیت پنجاب کی غدر پارٹی اور بنگال کی انقلابی پارٹی کی طرح ان مجاہدینِ حریت میں سے تھے جنہوں نے ملک کو آزاد کرانے کی تحریک اس وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروع کی تھی جب کہ کانگریس کے چہرہ پر سبزۂ خط کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا اس جرم کی پاداش میں وہ جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ زمانہ انھوں نے افغانستان روس، ہنگری، زیکوسلاویہ، ترکی، بعض عرب ممالک اور حجاز مقدس میں بسر کیا اور عسرت وافلاس اور پریشانی کا وہ عالم گزرا ہے جو کانگریس کے نامی گرامی لیڈروں کو کم ہی پیش آیا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود جب مولانا ۱۹۳۸ء میں تیس برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو اب ان کے سیاسی مسلک میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ بجائے مکمل آزادی کے مستعمراتی آزادی (DOMINION STATUS) کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان کو بدنام کرنا شروع کیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ! لیکن مولانا کی رائے میں کوئی تزلزل نہیں ہوا۔ وہ فرماتے تھے، میں آزادی کے سب سے پہلے علمبرداروں میں سے ہوں۔ لیکن جلاوطنی کے زمانے میں میں نے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ آزادی اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں بھی لاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے لوگ اب تک ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل نہیں بن سکے ہیں۔ اس لیے اب میری رائے ہے کہ مکمل آزادی کے بجائے ہم کو آزادی زیر سایۂ برطانیہ کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ وہ زمانہ تحریک آزادی کے شباب کا تھا اس لیے مولانا کی رائے کی حیثیت ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ ہو سکتی تھی، لیکن ہندوستان اور پاکستان کے گزشتہ پچیس برسوں کی تاریخ کو سامنے رکھیے تو کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی رائے درحقیقت ایک دیوانہ کی بکواس ہی تھی۔ مرزا غالب نے اس نکتہ کو کس بلاغت سے بیان کیا ہے :-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم ورہِ عام بہت ہے

یہی وہ پابستگی رسم ورہِ عام ہے جو قوم پروری اور حکومت پرستی، ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے چھوٹے پیمانے بانٹتی اور فیصلے کرتی ہے یہی وہ چھوٹے معیار اور پیمانے ہیں جنہوں نے محمد علی جناح اور حسرت موہانی کو فرقہ پرست بنایا اور انھوں نے ہی مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح سرسید کو اپنوں اور بیگانوں کی زبان سے کیا کچھ نہیں کہلوایا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

سرسید کی ہندوؤں کی طرف سے مایوسی اور اس کا ردعمل

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سرسید جو کچھ کر رہے تھے اس یقین سے کر رہے تھے کہ ان کے کاموں کا فائدہ کسی خاص ایک گروہ یا ایک فرقہ تک محدود نہیں، بلکہ گورنمنٹ ہندو اور مسلمان سب کے لیے عام ہے[1] چنانچہ آغازِ کار میں اور اس کے بعد بھی برسوں تک ہندوؤں نے سرسید کے ان کاموں کی بڑی قدر کی اور مسلمانوں کے ساتھ خود انھوں نے بھی چندے دیکر عملاً اور سرسید کو سپاسنامے پیش کر کے اس قدر دانی اور دل سے منت پذیری کا قولاً ثبوت بہم پہنچایا۔ لیکن حکومت کی پالیسی ہمیشہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی رہی تھی۔ آنریبل اے۔ ایچ۔ مزمدار

[1] چنانچہ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں جو ایک نہایت اہم لکچر دیا تھا۔ اس میں کہا تھا "میری توجہ ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مائل رہی ہے اور اسی کو میں ہندوستان کے لیے قوم کے لیے اور گورنمنٹ کے لیے بہت مفید سمجھتا ہوں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکھتے ہیں :-

"اول اول اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا، اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا سبب ہوا" (ہندوستان کا قومی ارتقاء (انگریزی) ص ۲۴۷)

اس بنا پر جب سرسید کی تحریک نے برگ و بار پیدا کرنے شروع کیے اور پورے ملک میں ان کی عظمت اور قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کیا جانے لگا تو ہندوؤں کی طرف سے سرسید کے کاز (CAUSE) کی مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ اس مخالفت کی داستان بہت طویل اور المناک ہے۔ یہ مخالفت اردو اور ہندی کشمکش کی شکل میں شروع ہوئی جس نے ہندو قومیت کے جذبہ کو فروغ دے کر ملک کے دو اہم فرقوں میں مستقل سیاسی اور قومی نزاع پیدا کر دیا۔ ۱۸۶۷ء میں بہار گورنمنٹ نے اردو کو دفاتر سے خارج کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اترپردیش میں ناگری حروف کو جاری کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہاں تحریک کا مرکز بنارس تھا چنانچہ اسی برس یہاں کے ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں سے اردو کو موقوف کرانے اور اس کی جگہ ہندی زبان اور دیوناگری حروف کو رائج کرنے کی تحریک شروع کر دی لیکن اس وقت مسلمانوں اور بعض ہندوؤں کی مخالفت کے باعث یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تو اب ہندوؤں نے پھر کمیشن کے سامنے ہندی کے مسئلہ کو پیش کیا ۱۸۶۷ء میں علی گڈھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک درخواست بھیجی گئی جس کا مسودہ خود سرسید نے تیار کیا تھا۔ اس درخواست میں گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک سررشتہ قائم کیا جائے اور کامیاب طلبار کو سندیں دی جائیں لیکن اس کی مخالفت میں ہندوؤں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے۔ غرض کہ ہندوؤں کی طرف سے بار بار اردو کی مخالفت اور ہندی کے مطالبہ کی آوازیں اٹھتی تھیں اور سرسید اس کے جواب میں برابر مضامین لکھتے اور گورنمنٹ کو اس خطرہ کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ لیکن سرسید کی کچھ پیش نہ چلی اور یہ نزاع برابر شدید سے شدید تر ہی ہوتا چلا گیا۔ بہر حال جیسا کہ سرسید کے خطوں، ان کے مضامین اور تقریروں سے پتہ چلتا ہے ان حالات نے سرسید کو ہندوؤں کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا اور ان کا قومی یک جہتی کا خواب ایک خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ جب ہندوؤں کا رویہ ایسا ہے تو پھر آیندہ ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ مسلمان تعلیمی اور معاشی اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت پسماندہ ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں۔ ہندو ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں چنانچہ زبان کے معاملہ میں ہندو مسلمان کا کیا سوال ہو سکتا ہے وہ تو ہوا اور پانی کی طرح مذہب کی بنیاد پر نا قابل انقسام ہوتی ہے۔ لیکن ہندوؤں نے اس معاملہ میں بھی چھوت چھات کی بحث اٹھا دی، ہندی کی تحریک کے زمانہ میں فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ایک لکچر میں سچ کہا تھا۔ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ سرسید نے سوچا کہ اگر ان حالات میں اصلاحات کا (جن کو حقوق کہا جا رہا ہے) نفاذ ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی کریں گے اور مسلمان منہ تکتے رہ جائیں گے۔ سرسید کا ذہن کسی مسئلہ پر فرقہ پرستی کا محدود دائرہ میں بند ہو کر سوچنے کا عادی نہیں تھا اس بنا پر انھوں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوا تو اس میں صرف مسلمانوں کا نقصان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوگا۔ بلکہ ہندوؤں میں بھی جو کم تعلیم یافتہ اور کم خوش قسمت طبقات ہیں وہ بھی اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کی دوڑ میں پھسڈی رہ جائیں گے اس سے ملک میں انتشار کی اور طبقاتیت پیدا ہوگی اور یہ ہندوستانی سوسائٹی تباہ ہو جائیگی۔ چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے کہا۔

"اس (جمہوری حقوق کے) مطالبہ سے مختلف قوموں میں کش مکش اور تناؤ پیدا ہوگا چونکہ یہاں بنگالی ہی تعلیمی میدان میں آگے ہیں اس لیے تمام سیاسی امتیازات کے وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہوں گے اور تمام ہندو، بہادر راجپوت، جوشیلے مرہٹے اور دوسری جنگ جو قومیں گورنمنٹ سے ناراض ہو جائیں گی، تشدد راہ پا جائے گا۔ اور ملک کا امن غارت ہو جائے گا۔"

اس بنا پر ان حالات میں ملک اور قوم کے مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ سیاست اور حقوق طلبی ان سب سے صرف نظر کر کے مسلمان خصوصاً (کیونکہ وہ ہندوؤں سے پیچھے تھے) اور سب باشندگان ہند عموماً اپنی تمام تر توجہ علوم جدیدہ کی تحصیل اور تعلیم پر مرکوز رکھیں اور گورنمنٹ سے لین دین کے جھگڑے میں نہ پڑیں۔ چنانچہ سرسید نے صاف صاف کہا

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۸۲)

ایک مرتبہ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۶ء ص ۱۹۹ پر لکھا:۔

"ہماری نصیحت ہمیشہ اپنے دوستوں کو یہی رہی ہے کہ رعایتوں کی درخواستوں کے پیچھے مت پڑو اور قوم کو ناشدنی امر کا متوقع مت کرو۔ بلکہ عملی طور پر قوم کی ترقی تعلیم پر کوشش کرو۔" (بحوالہ روشن مستقبل ص ۳۰۸)

© rasailojaraid.com